

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

قومیت اور جمہوریت کے نتائج سے آپ پھلی صحبت میں روشناس ہو چکے ہیں۔ اب میں اس ناپاک تثلیث کے اقنوم ثالث، یعنی حکومت کے پارٹی سسٹم سے آپ کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ یہ اس جال کا آخری بند ہے جس میں پھنس جانے کے بعد امیدزبوں کے لیے نقدِ جان ہار دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

حکومت کے پارٹی سسٹم سے مراد یہ ہے کہ انتخابات میں جماعت غالب اکثریت حاصل کرے اس کا سردار حکومت کا ناظم اعلیٰ، یعنی وزیر اعظم ہو، اور وہ صرف ان لوگوں کو وزارت میں شریک کرے جو اس پارٹی کے اصول اور نظام کی اطاعت قبول کر چکے ہوں۔ اس طریقہ کی بنیاد اور اسکی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ انتخابات میں پارٹی صرف ان لوگوں کو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کرتی ہے جنہیں وہ

اپنے مقاصد کے لحاظ سے موزوں ترین سمجھتی ہو۔

۲۔ رائے عام کو پارٹی کا ہم خیال بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، تاکہ جو امیدوار کامیاب

ہو وہ اپنے شخصی اثر سے نہیں بلکہ پارٹی کے اثر اور اس کے اعتماد پر کامیاب ہو۔ بالفاظ دیگر کسی حلقہ انتخاب میں کسی امیدوار کا جیت جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس حلقے کو پارٹی نے مسخر کر لیا۔

۳۔ اس طریقہ سے جب کسی پارٹی کو مجلس قانون ساز میں اکثریت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اپنی کامیابی کو اس بات کی دلیل قرار دیتی ہے کہ قوم کی اکثریت اس پر اعتماد رکھتی ہے، لہذا اسے اپنی پالیسی کے مطابق نظام حکومت کو چلانے کا حق حاصل ہے۔

۴۔ مجلس قانون ساز میں پارٹی کے ہر رکن کو جماعتی نظام کی پوری پابندی کرنی پڑتی ہے۔ وہ اپنی رائے اور عمل میں کسی قسم کی آزادی نہیں برت سکتا۔ وہ نہ کسی ایسی تجویز یا مسودہ قانون کی مخالفت کر سکتا ہے جو پارٹی کی طرف سے پیش ہو، نہ حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کر سکتا ہے، نہ خود اپنی طرف سے کوئی ایسی تجویز یا مسودہ قانون پیش کر سکتا ہے جسے پارٹی کی منظوری حاصل ہو، اور نہ اس وقت تک پارٹی کے طریق کار میں کوئی ترمیم کر سکتا ہے جب تک وہ پارٹی میں لب اثر پیدا نہ کر لے۔ اگر پارٹی میں رہ کر وہ کسی قسم کی آزادی رائے استعمال کرے گا تو اسے پارٹی سے خارج کر دیا جائیگا، اور دوسرے انتخاب میں وہ کسی ایسے حلقے سے کامیاب بھی نہ ہو سکیگا جو پارٹی کے ذمیر اثر ہو۔

۵۔ جو شخص پارٹی کے اصول و مقاصد کا سب سے بڑا وکیل ہو، اور جس کو پارٹی کی عظیم اکثریت کا اعتماد حاصل ہو، وہی اس کا لیڈر ہوتا ہے، اور اسی کے سپرویز کام کیا جاتا ہے کہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق نظام حکومت کو چلائے۔

۶۔ وزارت کی ترتیب میں پارٹی کا لیڈر صرف ان لوگوں کو لیتا ہے جو نہ صرف جماعتی نظام کے پابند ہوں بلکہ جماعت کی پالیسی کے مطابق نظام حکومت کو چلانے میں سب سے زیادہ مفید و کارآمد ہوں۔ پارٹی گورنمنٹ میں کسی وزیر کے لیے یہ قطعی ناممکن ہے کہ وہ جماعتی پالیسی سے انحراف کر سکے

یا کسی ایسے مفاد کی حفاظت کا نام بھی لے سکے جو جماعتی مفاد کے خلاف ہو۔

اس طرح حکومت کا پورا اقتدار ایک جماعت کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ وہی جماعت اپنے حسب مشا قوانین بناتی ہے، اسی کے وزراء ان قوانین کو نافذ کرتے ہیں، اور اسی کی پالیسی کے مطابق حکومت کی مشین کے تمام کل پرزے حرکت کرتے ہیں۔ یہ جماعت جب تک اکثریت میں رہے، اسے اپنے کسی کام میں قلیل اعداد جماعتوں سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ مدد لینا تو درکنار وہ انکی رائے کی پروا کرنے پر بھی مجبور نہیں ہوتی۔

اس طرز حکومت کی بنا، دراصل قومیت اور جمہوریت کے اصولوں پر ہے جس ملک میں ایک قوم رہتی ہو، اور جہاں جمہوریت کی بنیاد مستحکم ہو چکی ہو، صرف اسی ملک میں ایسا طرز حکومت جائز طور پر اختیار کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہندوستان میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ یہاں اس طرز حکومت کو اس لیے اختیار نہیں کیا گیا ہے کہ درحقیقت یہاں ایک قوم رہتی ہے اور جمہوریت کی بنیاد موجود ہے۔ بلکہ یہاں اسکو اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ ایک جماعت اس کے ذریعہ سے حکومت کا کلی اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے تاکہ حاکمانہ اقتدار سے کام لیکر ہندوستان کی مختلف قوموں کی قومیتیں مٹا سکے اور ان کو ایک ایسی قومیت میں مدغم ہو جانے پر مجبور کر دے جسکی وضع و ہیئت اور جسکی تہذیبی و تمدنی صورت متعین کرنے کا اختیار تمام تر اسی برسر اقتدار جماعت کے ہاتھ میں ہو۔

دن کی روشنی میں جو چیز امر واقعی کی حیثیت سے موجود ہو، اس سے کوئی آنکھوں والا انکار نہیں کر سکتا۔ واقعات تو یہ ہیں کہ :

۱- کانگریس پارٹی ہندوستان میں جہاں کہیں کامیاب ہوئی ہر ہندوؤں کے ووٹوں کا میاب ہوئی مسلمانوں میں اس کو بحیثیت مجموعی پانچ فی صد کی زیادہ ووٹ نہیں ملے۔ اسکے صاف معنی یہ ہیں کہ اسکو ملک کی آبادی کے صرف ایک حصہ کا اعتماد حاصل ہے، اور چند صوبوں کی مجلس قانون ساز میں اسکی اکثریت محض اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان صوبوں میں وہ قوم کثیر التعداد واقع ہوئی ہے جسے اس پارٹی پر اعتماد ہے۔

۲- اسکے ارکان تمام تر ہندو ہیں اور ”مسلمان“ اس میں آئے میں نمک کی حیثیت رکھتے ہیں۔
 ۳- اس میں کسی غیر ہندو کو لیڈر کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ باوجودیکہ ایسے متعدد غیر ہندو اس پارٹی میں موجود ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو ”ہندی قومیت“ میں پوری طرح جذب کر دیا ہے، جو اپنی قوم سے قریب قریب کٹ چکے ہیں، اور جنکی خدمات بھی کسی ہندو کانگریسی سے کم نہیں ہیں، مگر ابھی تک چونکہ انہوں نے اپنے نام نہیں بدلے ہیں، اور ابھی تک غیر ہندو قومیت سے تعلق رکھنے کی بو انکے ناموں سے آ رہی ہے، ایسے ان میں سے کسی کو ہندو اکثریت کے کسی صوبہ میں پارٹی لیڈر بننے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ مسٹر نیرمان اور ڈاکٹر محمود کی مثالیں اسکی نمایاں ترین مثالیں ہیں۔ اگر ایک نام مسٹر کھیر اور دوسرے کا مسٹر سنہا ہوتا تو یقیناً ہی اپنے اپنے صوبوں میں پارٹی لیڈر ہوتے۔

۴- اس پارٹی کی ذہنیت اور اسکے طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنے نظام میں اگر کسی غیر ہندو کو اثر و اقتدار کی کوئی جگہ دیگی بھی تو صرف اُس وقت جبکہ اسے اس امر کا پورا اطمینان حاصل ہو جائے کہ وہ پارٹی کے مفاد کی خدمت، ایک ہندو کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریقہ سے کر سکے گا، مثلاً غیر ہندو قوموں کو فریب دینا، یا تعلیم اور تہذیب و تمدن کے مسائل میں پارٹی کی پالیسی کو غیر ہندو قوموں پر نافذ کرنا۔ اس باب میں کانگریس پارٹی کا وہی حال ہے جو انگریزی حکومت کا حال ہے کہ وہ کسی ہندوستانی کو بڑے ذمہ دارانہ عہدہ صرف اسی حالت میں دیتی ہے جب اسے یہ توقع ہو کہ وہ انگریزی

امپیریلزم کی خدمت انگریز کی یہ نسبت زیادہ اچھی طرح انجام دیگا۔ اگر وہ کسی ہندوستانی کو گورنر یا وائسرائے بنا کے تو یہ اس بات کا ثبوت نہ ہوگا کہ ہندوستانیوں کے حق میں اسکی پالیسی بدل گئی ہے، بلکہ دراصل یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ ہندوستانیوں میں اسکو اتنا بڑا غدار مل گیا ہے جسکی غداری پر انگریز کی وفاداری سے بھی زیادہ بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

مگر ان صریح حقائق کے باوجود کہا یہ جاتا ہے کہ :

۱۔ کانگریس پارٹی، ہندو پارٹی نہیں ہے بلکہ ”قومی پارٹی“ ہے، یعنی اس ”قوم“ کی پارٹی ہے جو ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری قوموں سے مل کر بنتی ہے۔

۲۔ اس پارٹی کا اکثریت میں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اسکو ”قوم“ کی اکثریت کا اعتراف حاصل ہے۔

۳۔ اس دلیل سے وہ انگلستان کی طرح ایک پارٹی کی حکومت قائم کرنے میں حق بجانب ہے۔

۴۔ اس پارٹی کی موجودگی میں ہندوستان کی کسی قوم کو مجالس قانون سازی میں اپنی الگ پارٹی بنانیکا حق ہی نہیں ہے۔ بلکہ اسکے نمائندوں کو کانگریس کے عہد نامے پر دستخط کر کے کانگریس پارٹی کے نظام کا ایک جز بن جانا چاہیے۔

۵۔ اگر غیر ہندو قومیں اپنی الگ پارٹیاں رکھنے پر اصرار کریں گی تو کانگریس پارٹی انکے ساتھ

مخلوط وزارت نہیں بنائیگی، بلکہ صرف اپنی پارٹی کی وزارت بنائیگی اور اس وزارت میں صرف ان غیر ہندو اشخاص کو لیا جائیگا جو پارٹی کے نظام میں جکڑے ہوئے ہوں یا وزارت کے لالچ میں

اپنے آپکو خود جکڑ والیں۔ دوسرے الفاظ میں اسکا مطلب یہ ہے کہ قلیل التعداد اقوام میں کسی قوم کو بحیثیت ایک قوم کے حکومت میں حصہ دار نہیں بنایا جاسکتا، بلکہ انکے افراد کو صرف انفرادی حیثیت سے

حکومت کا خادم بنایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ پارٹی کی اطاعت کا حلف لیں، ورنہ ”قومی“ وزارت بغیر اسکے بھی بن سکتی ہے کہ کوئی غیر ہندو اس میں شریک ہو۔

یہ انگریزی راج کی حمایت و حفاظت میں ہندو راج قائم کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔ جیسا کہ میں اوپر ظاہر کر چکا ہوں، موجودہ حالات میں اس امر کی تو کبھی توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ ہندو اکثریت کے کسی صوبہ میں کوئی غیر ہندو پارٹی لیڈر بن سکے گا، اور پارٹی میں غیر ہندو ارکان کا اتنا اثر حاصل ہو سکیگا کہ جماعتی نظام اور اسکی پالیسی کو وہ کم از کم اپنے قومی مفاد کے خلاف نہ بننے دیں۔ ایسی حالت میں اگر پارٹی سسٹم کی حکومت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کے دو پہلو ہوں گے، اور دونوں یکساں مضر ہوں گے:

۱۔ اگر مسلمان اپنی علیحدہ پارٹیوں کو توڑ کر نام نہاد ”قومی پارٹی“ میں ضم ہو جائیں تو انکی اپنی جماعتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ پارٹی کے ڈسپلن میں جکڑ دیے جائیں گے، اور ڈسپلن کے خلاف کوئی آواز بلند کرنا، یا کوئی تجویز اور مسودہ قانون اپنے قومی مفاد کے لیے بطور خود پیش کرنا، یا پارٹی کی کسی ایسی تجویز اور مسودہ قانون کی مخالفت کرنا، جو انکے قومی مفاد کے خلاف ہو، ان کے لیے ناممکن ہوگا وزارت میں بھی کسی مسلمان کی شرکت مسلمانوں کی اجتماعی تائید و رضا پر نہیں بلکہ پارٹی کے ہندو لیڈر اور پارٹی کی ہندو اکثریت کے معیار انتخاب پر مبنی ہوگی، اور غیر ہندو کے لیے ان کا معیار انتخاب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یا تو وہ ہندی قومیت میں جذب ہو چکا ہو، یا پھر ایک وفادار خادم کی حیثیت سے کام کر سکے، چاہے اپنے گھر پر تفسیر قرآن ہی کیوں نہ لکھتا ہو۔ اس طرح قانون سازی اور تنفیذ قانون، اور سرکاری پالیسی کی تشکیل سے مسلمان اور تمام غیر ہندو عملاً بے دخل ہو جاتے ہیں۔

۲۔ اگر مسلمان اپنی علیحدہ پارٹیاں قائم رکھیں تب بھی نہ تو حکومت کے اثر و اقتدار میں انہیں کوئی حصہ مل سکتا ہے، اور نہ قانون سازی میں وہ اپنی اقلیت کی وجہ سے کوئی مؤثر طاقت استعمال کر سکتے ہیں

لیکن یہ دونوں پہلو بھی صرف اس وقت تک نمایاں ہو رہے ہیں جب تک انتخاب جداگانہ ہے اور اس میں مسلمانوں کو اپنی قومی خواہش اور رائے کے اظہار کا موقع مل رہا ہے۔ جب یہ چیز باقی نہ رہیگی تو کسی کے لیے یہ کہنے کا موقع بھی باقی نہ رہ سکیگا کہ فلاں کام محض اکثریت کے زور پر مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کیا گیا، بلکہ اس وقت تو خود مسلمان ہی کے نام سے وہ سب کچھ ہو گا جو ”قوم پرست“ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی غرض کیلئے وہ کوشش کر رہے ہیں کہ جداگانہ انتخاب کو مخلوط انتخاب سے بدل دیا جائے اور جب تک جداگانہ انتخاب باقی ہے، اسکے اثر کو باطل کر نیکے لیے انہوں نے مسلم ماس کانٹیکٹ کی تحریک شروع کر دی ہے، تاکہ وہ اپنی پسند کے ”قوم پرست مسلمانوں“ کو عامہ مسلمین کے دوٹوں سے منتخب کرا سکیں۔

یہاں پہنچ کر آپ باسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس جدوجہد کو تمام ہندوستان کیلئے جنگ آزادی قرار دیا جا رہا ہے اسکی تمام اخلاقی و مادی طاقتیں کس طرح محض ایک قوم کی آزادی اور باقی تمام قوموں کی غلامی — پہلے سے بدتر غلامی — کیلئے استعمال کی جا رہی ہیں۔ قومیت، جمہوریت، اور پارٹی سسٹم کے اصول صرف اسیلئے اختیار کیے گئے ہیں کہ وہ ہندو قوم کو ہندوستان کی حکمران قوم بنانے کے لیے سب سے زیادہ مفید ہیں۔ اگر ان اصولوں کو تسلیم کر کے ہم جنگ آزادی میں شریک ہوں تو اسکے معنی دراصل یہ ہونگے کہ ہم انگریز کی غلامی کو ہندو کی غلامی سے بدلنے کے لیے جنگ کریں!

فریب تو دیکھیے، پہلے ہندوستان کو ایک قوم فرض کیا جاتا ہے، تاکہ اس مفروضہ پر جمہوریت، اور جمہوریت پر پارٹی سسٹم کی حکومت قائم کی جاسکے۔ پھر جب جمہوریت اور پارٹی سسٹم کے ذریعہ سے حکومت کا اقتدار سمٹ کر ایک جماعت کے ہاتھ میں آ جاتا ہے، تو اسکو ہوشیاری کے ساتھ تعلیم کی نئی تجاویز، زبان و رسم الخط کی تدریجی ترمیم، قوانین معاشرت کی شکست و ریخت

اور معاشی وسائل پر قابو حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تاکہ ان طاقتوں سے کام لیکر ایک ”قوم“ بنائی جاسکے۔ یہ ایک منحوس چکر (Vicious Circle) ہے جو فریب سے شروع ہو کر ظلم پر ختم ہوتا ہے اور پھر ظلم سے شروع ہو کر فریب پر جا پہنچتا ہے۔ اس چکر میں ہندوستان کی قبیل اتحاد قوموں کو پھانسنے کا نام ”جنگ آزادی“ رکھا گیا ہے!

اب سے دس سال پہلے جب نہرو رپورٹ مرتب ہوئی تھی، اسی وقت معلوم ہو چکا تھا کہ

”وہ آزادی“ کے ان علمبرداروں کی اصلی نیت کیا ہے۔ جن کو خدا نے عقل دی تھی وہ اسی وقت سمجھ

چکے تھے کہ انگریزی سنگینوں کی حفاظت میں ہندو راج قائم کرنے کا نام ”سوراج“ رکھا گیا ہے، اور

ان لوگوں کی تمام جدوجہد اسی قسم کے سوراج کے لیے ہے۔ یہی نقشہ جس پر آج ہندوستان کے

نظام سیاست کی تعمیر ہو رہی ہے، نہرو رپورٹ میں پیش کیا گیا تھا۔ یہی قومیت کا مفروضہ تھا۔ یہی

جہو بیت کے اصول تھے۔ اور اسی طرح حکومت کے پورے اقتدار کو ایک جماعت میں مرکوز کرنے

کی تجویز تھی۔

جب مسلمانوں کی تمام جماعتوں نے بالاتفاق اسکو رد کر دیا تو لاہور کانگریس میں اس رپورٹ

کو غرقِ ردا ی کر کے ”آزادی“ کا علم بلند کر دیا گیا۔ جاننے والوں نے پھر کہا کہ یہ محض ایک فریب ہے۔ ان

لوگوں کا اصل مقصد وہی ہے جسکا اظہار یہ اپنے مجوزہ دستور اساسی میں کر چکے ہیں، اور اب یہ آزادی

کا علم محض دھوکا دینے کیلئے بلند کیا جا رہا ہے۔ مگر مسلمانوں کے دو طبقے جو سب سے زیادہ کمزور تھے اس

آزادی کے نزلہ سے ماؤف ہو گئے۔ ایک طبقہ جو مغربی تعلیم و تہذیب کے اثر سے اسلامی قومیت کے

احساس کو کھو چکا ہے اور ہر چیز کو اپنی معاشی فلاح کے عوض بیچنے پر تیار ہے۔ دوسرا ان علماء کا طبقہ جو

زمانہ جدید کی سیاسی چالوں کو سمجھنے سے طبعاً معذور ہیں۔ ان دونوں طبقوں پر آزادی کے جھنڈا

کا وہی اثر ہوا جو جنگ صفین میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج پر لشکر معاویہ کے نیزوں سے قرآن
 لٹکتے دیکھ کر ہوا تھا۔ اُس وقت بھی مسلمانوں کی قومی کمزوری کا صحیح اندازہ لگا کر ناجائز فائدہ اٹھایا گیا تھا
 اور اب بھی ایسا ہی ہوا۔ اس وقت بھی مسلمانوں کے ایک گروہ کی غلطی نے اسلامی تاریخ کا رخ
 ہمیشہ کیلئے بدل دیا، اور اب بھی جو غلطی ہوئی اور ہو رہی ہے وہ کم از کم ہندوستان میں اسلامی
 تاریخ کا رخ پہلے سے بھی زیادہ افسوسناک نتائج کی طرف پھیرتی نظر آتی ہے۔ یہ لوگ آزادی کے
 جھنڈے کو دیکھ کر دیوانہ وار اس کی طرف لپک گئے، اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے اور غیر سب
 پر اپنی قوم کی اس کمزوری کا راز فاش کر دیا کہ کتنی آسانی کے ساتھ اس قوم میں پھوٹ ڈالی جاسکتی ہے،
 اور کتنی آسانی کے ساتھ ہر فریب کار دشمن کو اس قوم میں اپنے مطلب کے ہزاروں آدمی مل سکتے ہیں۔

ان دو گروہوں کی نادانی سے اتنا بڑا نقصان ہم کو پہنچ چکا ہے جسکی تلافی اب بمشکل ہو سکتی
 ہے، اور اس سے زیادہ بڑا نقصان اب پہنچنے والا ہے جسکی تلافی شاید بمشکل بھی نہ ہو سکے گی۔ مختصر الفاظ
 میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو مسلمان سخت پرانگندگی و انتشار میں مبتلا ہو گئے، آنے والے
 خطرات کے مقابلہ میں انکو منظم کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کی جاسکی اور انکی قومی زندگی کے ایسے
 پندرہ سال خام کاریوں میں ضائع ہو گئے جن کا ایک ایک لمحہ فیصلہ کن تھا۔ دوسری طرف ہمسایہ قوم
 اپنی منظم جدوجہد اور خود مسلمانوں کی امداد و اعانت سے انگریزی سلطنت کو مرعوب کرنے میں کامیاب
 ہو گئی۔ ہرور پورٹ میں جس نصب العین کا انہوں نے اظہار کیا تھا، دس سال کے بعد ظاہر ہو گیا کہ
 آج بھی وہی نصب العین انکے سامنے ہے، بلکہ اس نصب العین کی پہلی منزل پر وہ پہنچ بھی گئے
 اور اب آخری منزل ان سے بہت قریب ہے۔ دستور جدید کی رو سے صوبوں میں جو حکومت خود اختیاری
 عطا کی گئی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ٹھیک اسی نقشہ پر مستقبل کے ہندوستان کی تعمیر شروع

کر دی ہے جو دو سال پہلے وہ بنا چکے تھے، اور اب اُن کا قدم اپنی آخری منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے، یعنی یہ کہ مرکزی حکومت پر بھی ان کو اقتدار حاصل ہو جائے، تاکہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انکی حکومتوں کو بھی مرکزی اقتدار کے واسطے سے قابو میں لاکر ”سوراج“ کے نصب العین — ہندو راج زیر سایہ سلطنت برطانیہ — کی تکمیل کر دی جائے۔

مگر یہ نتیجہ سامنے آجانے کے بعد بھی ہمارے آزادی کے دیوانوں کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ فرعون کے گھر میں بچے فرعون نشوونما پا رہا ہے اور عنقریب ولی عہدی کی رسم ادا ہونیوالی ہے۔ مگر یہ سادہ لوح اب بھی ہندوستان بھر میں مسلمانوں کو یقین دلاتے پھر رہے ہیں کہ فرعون کے ہاں موسیٰ پرورش پا رہا،۔ وہاں آپکی قومیت کو ختم کر دینے کے لیے فریح اطفال سے زیادہ خطرناک اور زیادہ کارگر پالیسی پر عمل درآمد شروع ہو چکا، اور حضرت فرما رہے ہیں کہ فی الحال تو آزادی کی جنگ — یعنی اپنی قبر آپ کھودنے — میں آنکھیں بند کر کے تشریک ہو جاؤ، پھر آزادی حاصل ہو جائیکے بعد — یعنی قبر میں مدفون ہو جائیکے بعد — اٹھ کر اپنی قومی زندگی دحیات بعد الموت! کی حفاظت کر لینا۔

کہا جاتا ہے کہ قومیت کے مفروضے، اور جمہوریت کے اصولوں، اور پارٹی سسٹم پر جو نظام حکومت بن رہا ہے، اُس میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کیلئے کراچی بنیادی حقوق بالکل کافی ہیں۔ مگر کیا یہ حقیقت ہے؟ بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کا ماخذ ۱۶۸۹ء کا اعلان حقوق اہل انگلستان ہے۔ اس کے بعد اسی قسم کے اعلانات حقوق مختلف مغربی اور خصوصاً امریکی دستوروں میں شامل کیے جا چکے ہیں۔ مگر اس سسٹم کے اعلانات کبھی کسی ایسی جماعت کے حقوق کا تحفظ نہ کر سکے جسے تہذیب، یا مذہب، یا نسل و رنگ نے اپنے ہم وطنوں کی اکثریت سے جدا کر رکھا ہو۔ انگلستان میں اس اعلان کے باوجود ڈیڑھ سو

برس تک کیتھولک فرقہ پر سخت منظام ہوتے رہے۔ ۱۸۷۹ء میں ان کی اصلاح حال کیلئے ایک تجویز پیش ہوئی مگر نصف صدی تک کوئی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۸ء تک انکے حق میں ۱۳ اہل پیش ہوئے، اور ہر بار پارلیمنٹ نے ان کو رد کر دیا۔ آخر کار ۱۸۷۹ء میں ان کو پارلیمنٹ کی رکنیت اور سیاسی و نظمی ادارت کی شرکت کا حق ملا، مگر اس وقت جبکہ انکی جدوجہد خطرناک حدود تک پہنچ چکی تھی۔

ممالک متحدہ امریکہ کے دستور اساسی میں بھی باشندگان ملک کے بنیادی حقوق کا صریح اعلان کیا گیا تھا، مگر قریب قریب ۷۵ سال تک امریکہ کے لاکھوں حبشی باشندے نہ صرف ان حقوق سے بلکہ عام انسانی حقوق سے بھی محروم رہے۔ ۱۸۶۰ء کی خانہ جنگی کے بعد ان کو کسی حد تک انسانی حقوق حاصل ہو گئے، لیکن حقوق شہریت سے اب بھی وہ اسی طرح بے بہرہ ہیں، بلکہ آج اس بیسیویں صدی کی چوتھی دہائی میں بھی ان کو زندہ جلا دینے اور جانوروں کی طرح ان کا شکار کرنے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، درانحالیکہ امریکہ کی مہذب سلطنت میں پولیس اور عدالت کا ایک مکمل نظام موجود ہے۔

یورپ کی ۲۵ ریاستوں میں ساڑھے تین کروڑ باشندے اس وقت اقلیتوں کی حیثیت سے رہتے ہیں، اور قریب قریب ان تمام اقلیتوں کے بنیادی حقوق، مقدس تحریروں کی صورت میں لکھے ہوئے موجود ہیں، مگر اسکے باوجود اکثریت کی حکومت ہر جگہ ان پر اپنی زبان اور اپنے نظام تعلیم کو مسلط کر رہی ہے، اور ہر قسم کی تمدنی، معاشی اور سیاسی تکلیفیں ان پر ڈال رہی ہے تاکہ یا تو وہ اکثریت کی قومیت میں جذب ہو جائیں یا صفحہ ہستی سے ناپید ہو جائیں۔

۱۹۱۹ء کے وائمار کانسیٹیوشن (Weimar Constitution) کی رو سے جرمنی میں بھی تمام باشندگان ملک کے بنیادی حقوق محفوظ کیے جا چکے ہیں۔ مگر آج وہاں کی غیر آریہ نسل کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ ان کیلئے جرمنی کے حدود میں عزت کے ساتھ روٹی کبانا قریب

قرب محال ہو گیا ہے، اور وہاں سے نکل جانا بھی اتنا ہی محال ہے۔ سرکاری اور خانگی دونوں قسم کی ملازمتوں کے دروازے انکے لیے بند ہیں۔ کوئی آزاد پیشہ بھی وہ آسانی کیساتھ نہیں کر سکتے۔ عدالتوں میں انکے ساتھ صریح نسلی امتیاز برتا جاتا ہے، اور انصاف کا نظریہ، یہ قائم کیا گیا ہے کہ ہر غیر آریہ پیدائشی مجرم ہے تا وقتیکہ وہ اپنے آپ کو غیر مجرم ثابت نہ کر دے۔ عام باشندے اگر ان کے ساتھ کوئی لین دین یا کسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں تو ان پر حکومت کا عتاب ہوتا ہے۔ ملک کے مدارس میں ان کے بچوں پر ناقابل برداشت پابندیاں ہیں، اور اگر وہ ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنیکے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو مہاجر قرار دے دیا جاتا ہے تاکہ وہ پھر واپس نہ آسکیں۔ والدین اگر خود اپنے بچوں سے ملنے کے لیے جانا چاہتے ہیں تو ان کو صرف ہجرت کا پاسپورٹ دیا جاتا ہے، اور ہجرت کرنے والے کیلئے یہ قانون بنایا جا چکا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کا صرف دس فی صدی جرمنی سے باہر لے جاسکتے ہیں، باقی سب کچھ ضبط۔

یہ ان ”قوموں“ کا حال ہے جو ”ادمان“ سے بنی ہیں، اور ہمیں آج تک کسی ایک ملک کی مثال بھی ایسی نہیں ملی جہاں دستور اساسی بنیادی حقوق نے کسی اقلیت کو اپنے ہم وطنوں کی اکثریت کے ظلم سے بچایا ہو۔ ہر جگہ ملک کی پوری آبادی کو ایک ہی قوم فرض کیا گیا ہے، مگر جہاں اقلیت اور اکثریت میں ہر دو یا تہذیب یا نسل یا رنگ یا زبان کی بنیاد پر قومی امتیاز موجود ہے، وہاں جب اکثریت کو حاکم مطلق بننے کا موقع ملا تو اس نے اعلان حقوق کے باوجود یہی کوشش کی کہ یا تو اقلیت کو شودر بنا کر رکھے، یا اس کے امتیازی وجود کو فنا کر دے۔

ہماری قوم کے جو حضرات بنیادی حقوق کے اطمینان پر جنگ آزادی میں شریک ہو رہے ہیں ان میں سے ایک طبقہ دہی یعنی ”قوم پرست“ طبقہ، تو اپنے امتیازی وجود کو قربان کرنے پر بخوشی آمادہ ہے کہ دین جائے گا، تن تو ابھی طرح پلے گا۔ اب باقی ماندہ حضرات ارشاد فرمائیں کہ وہ ان دونوں صورتوں

میں سے کس صورت کیلئے راضی ہیں؟

مزید توضیح کیلئے ذرا اُن بنیادی حقوق کا تجزیہ بھی کر دیکھیے جو کراچی کے ریزولوشن میں بیان کیے گئے ہیں۔

پہلی دفعہ میں ہندوستان کے ہر باشندہ کو اظہارِ رائے اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے، بشرطیکہ وہ ایسے مقاصد کیلئے ہو جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہ ہوں۔ قانون اور اخلاق کی شرط اس آزادی کو ہر وقت باطل کر سکتی ہے۔ جمہوریت کے انگریزی نظریہ کی بنا پر قانون بنانا اور اخلاق کا معیار مقرر کرنا مطلقاً اکثریت کے اختیار میں ہوگا، اور اکثریت ہی کی حکومت اس کو نافذ کرے گی۔ لہذا اقلیت کی آزادی کے حدود گھٹانا یا بڑھانا محض انکے اختیار تیزی پر موقوف ہوگا۔

دوسری دفعہ میں ہر باشندہ ہند کو ضمیر کی آزادی، اور اپنے مذہب پر اعتقاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی عطا کی گئی ہے، بشرطیکہ وہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو۔ یہاں پھر وہی شرط ہے اور یہ شرط اس آزادی کو ہر وقت سلب کر سکتی ہے۔ تاہم اگر اکثریت نے بڑی فیاضی سے کام لیا اور یہ آزادی ہم کو پوری طرح بخش بھی دی، تو اس سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی آزادی تو انگریزی حکومت نے بھی ہم کو دے رکھی ہے، مگر اسکے باوجود ڈیڑھ سو برس کے اندر ہماری مذہبیت مضمحل اور ہماری تہذیب نیم مردہ ہو کر رہ گئی۔ جبکہ حکومت کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں نہ ہوں اور ایک ایسی جماعت ان اختیارات کو استعمال کرے جو ہمارے اصول تہذیب سے قطعاً نا آشنا، اور بالکل مختلف قسم کے نظریات تہذیب اخلاق و تمدن کی گرویدہ ہو، تو اس حکومت کے ماتحت ہمیں کبھی آزادی حاصل ہونیکا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہمیں زبردستی نماز پڑھنے سے نہیں روکا جائیگا بلکہ ہمارے اندر وہ ارتداد آہستہ آہستہ اتارا جائیگا جس سے ہم خود نماز پڑھنا چھوڑ دیں۔ ہماری سجدیں

توڑی نہیں جائیگی بلکہ ہمارے دل و دماغ کو اندر سے بدلا جائیگا تاکہ یہ مسجدیں دیران ہو کر خود بخود آثار قدیمہ میں تبدیل ہو جائیں۔ ہماری عورتوں کے چہروں کے پولیس سپاہی زبردستی نقاب نہ نوچینگے بلکہ مدرسے کے معلم نہایت شفقت و رحمت کیساتھ انکے ذہن میں وہ معیار اخلاق پیوست کرینگے جسکی بنا پر وہ گھر کی ملکہ بننے کے بجائے اسٹیج کی رتقا بننا زیادہ پسند کریں گی۔ یہ آزادی محض ایک انیون ہے، تاکہ اسکی بینک میں ہم بڑھ سوتے رہیں، اور ہمارے گرد و پیش زمین و آسمان بدلتے چلے جائیں۔ اس آزادی پر وائے کو لیکر جو مولوی صاحب پشاور سے مدراس تک ماس کانٹیکٹ کی تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ پروانہ آپ کو تو اتنی آزادی ضرور دیتا ہے کہ رات دن قال اللہ و قال الرسول میں مشغول رہیں، آپکی ڈارمی یقیناً زبردستی نہیں موندی جائیگی، نہ آپکی عبا ضبط کی جائیگی، نہ آپکی تسبیح چھینی جائیگی، نہ آپکی زبان درس حدیث و قرآن سے روکی جائیگی، مگر اس امر کی وہ کوئی ضمانت نہیں دیتا کہ آپکی نسل سے دوسری پشت میں کوئی اودے شکر اور تمسیری پشت میں کوئی دیو یکارانی برآمد نہ ہوگی۔ ایسے پروانہ آزادی کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب کی فطرت مغولانہ نہیں بلکہ قاعلانہ آزادی مانگتی ہے۔ ہم استقلال وطن اسیلے چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو، اپنا نظام تعلیم ہم خود بنائیں، اپنی تہذیب و تمدن کے مسخ شدہ نظام کو ہم خود اپنی طاقت سے درست کر سکیں۔ اگر یہ نہیں تو ہمارے لیے یکساں ہے، چاہے حکومت باہر کے کفار کی ہو یا گھر کے کفار کی۔

تمسیری دفعہ اس امر کا اطمینان دلاتی ہے کہ قلیل التعداد جماعتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی کلچر، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائیگی۔ حکومت کے روپے اور اسکی طاقت سے ہندی کو ہندوستان کی "قومی" زبان بنانا اس دفعہ کے خلاف نہیں ہے۔ اگر نظام تعلیم ایسا بنایا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب کا رنگ اس سے بالکل خارج کر دیا گیا ہو، بلکہ اگر نظام تعلیم کو اس قصد کے ساتھ ایسے نقشہ پر مرتب کیا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب اپنی موت آپ مر جائے، تو ایسا کرنا بھی اس دفعہ کے خلاف نہیں۔ درحقیقت اس دفعہ کا مطلب یہ ہے ہی نہیں کہ اقلیتوں کی زبان اور انکی کلچر کو حکومت کے رسد خانے سے زندگی کی غذا دی جائیگی، بلکہ اسکا مطلب صرف یہ ہے

کہ انکو زبردستی قتل نہ کیا جائیگا۔ باقی رہی یہ بات کہ کمی غذا وہ خود سوکھ سوکھ کر مر جائیں، تو حکومت پر اسکی کوئی ذمہ داری نہیں، بلکہ یوپی کے وزیر تعلیم کی زبان سے ہم کو بتایا جاتا کہ انکا سوکھ سوکھ کر مر جانا ہی مطلوب ہے، تاکہ انکی راکھ سے "ہندوستانی تہذیب" کا قفنس پیدا ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا بنیادی حق بھی ہمکو انگریزی حکومت میں حاصل ہے۔ اس نے بھی ہم کو اردو بولنے اور لکھنے سے نہیں روکا (بلکہ وزیر اعلیٰ اسکول قائم کیے) اور کوئی ایسا آرڈیننس پاس نہیں کیا کہ ہم اپنی کلچر کے مطابق زندگی بسر نہ کریں۔ لیکن اس بنیادی حق نے ہماری زبان اور ہماری کلچر کو زندگی کی طاقت نہیں بخشی۔ اگر یہی حالت اس حکومت میں بھی ہو جسکو "قومی حکومت" کے نام سے موسوم کیا جاتا، تو ہمارے لیے ایسی "قومی حکومت" یعنی غیر قومی حکومت ہوگی۔ ہمیں قومی حکومت کی ضرورت تو اس لیے ہے کہ ہم حکومت کے وسیع ذرائع سے اپنی زبان اور اپنی کلچر کو اس طرح غذا دے سکیں جس طرح آن اوقوں میں دیا کرتے ہیں۔ ورنہ بطور خود اپنی قومی ضروریات کا انتظام کر لینے کی آزادی تو ہمیں اب بھی حاصل ہے۔ اسکے لیے ہمیں کسی جنگ آزادی کی ضرورت نہیں۔

چوتھی دفعہ کہتی ہے کہ قانون کی نظر میں تمام شہری مساوی ہیں۔ جات پات، مذہب اور صنف کا کوئی امتیاز انکے درمیان نہ ہوگا۔۔۔ یہ نہایت عمدہ دفعہ ہے۔ لیکن مساوات کا تصور ہر تہذیب میں مختلف ہوتا ہے۔ اگر جمہوری اصول پر کل کوئی اکثریت میراث میں عورت اور مرد کا حصہ برابر کرے تو قانون پاس کرے اور اسکی مخالفت کرنیوالی اقلیت کا اسی طرح مذاق اڑائے جس طرح ابھی چند روز پہلے مسٹر واس کے بل کی مخالفت کرنیوالوں کا مذاق سنٹرل اسمبلی میں اڑایا جا چکا ہے، تو یہ دفعہ ہمارے کسی کام نہ آئیگی۔

پانچویں دفعہ اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ کسی باشندہ ملک پر اسکے مذہب یا جات پات، یا عقیدہ و مسلک، یا صنف کی وجہ سے ایسی پابندی عائد نہ کی جائیگی کہ وہ کسی سرکاری ملازمت یا عزت و اقتدار کسی منصب یا کسی پیشہ اور کاروبار میں داخل نہ ہو سکے۔ اس دفعہ اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں۔ اگر نظام حکومت کسی ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو ہماری تہذیب سے کوئی ہمدردی نہ رکھتی ہو تو اس دفعہ عطا کردہ حقوق شریف مسلمان ہونے والوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے

مالی تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔

چھٹی دفعہ تمام باشندوں کو سڑکوں اور تالابوں اور کنوؤں اور مدرسوں وغیرہ کا استفادہ کا مساوی حق دیتی ہے۔۔۔۔۔ یہاں بشرطیکہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو کی قید نہیں لگائی گئی، جس طرح پہلی اور دوسری دفعہ میں لگائی گئی ہے۔ دوسری دفعہ کی رو سے گائے کی قربانی بند کی جاسکتی ہے، مگر چھٹی دفعہ سڑکوں کے استعمال پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کرتی کہ نماز کے وقت باجا بجا کر مسلمانوں کو پریشان نہ کیا جائے۔

یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جن کے اعلان کو ایک نعمتِ عظمیٰ قرار دیا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس اعلان کے معاوضہ میں ایک ایسی حکومت کو خود اپنے اوپر مسلط کرنے کے لیے جنگ کریں، جس کی پالیسی کی تشکیل، جس کے قوانین کی تشریح اور جس کے احکام کی تنفیذ میں ہم مفروضہ قومیت، اور اصولِ جمہوریت اور پارٹی سٹم کی بنیاد پر کسی طرح اپنا اثر استعمال نہیں کر سکتے۔ دوسرا نفاذ میں ہماری خدمات ایسے حال کی جارہی ہیں کہ بس فرعون کی جگہ اسکے بیٹے کو تخت نشین کرادیں، رہا ہمارا اپنا حال، توجو بنی اسرائیل کی سی پوزیشن ہیں فرعون کے عہد میں حاصل ہے، ابن فرعون کہتا ہے کہ وہی میرے عہد میں بھی حاصل رہیگی

(باقی)